DELHI UNIVERSITY
LIBRARY

DELHI UNIVERSITY LIBRARY SYSTEM

Cl No

Ac No.

Date of release of loan

This book should be returned on or before the date last stamped below An overdue charge of 20np will be charged for each day the book is kept overtime

24 JAN 1985

اسلامی نظامِ تعلیم

جس میں فاضل مستشرق نے اسلامی
نظامِ تعلیم اور اسلامی مدارس کے
طریقۂ تعلیم پر مبصرانہ بحث کی ہے۔

(مترجمہ)

فضل کریم خان درانی۔ بی۔ اے

سنہ ۱۹۳۲ء

قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

طبع اول ایک ہزار

دیباچہ مترجم

اسلامی نظام تعلیم پر دو دَور گذرے ہیں۔ سنہ ہجری کی پہلی چار صدیوں میں تعلیمی درسگاہیں یا تو مساجد کے اندر یا اُن سے ملحق تھیں پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے دُوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اِس دَور کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اسلامی دُنیا کے مختلف شہروں میں عظیم الشان دار العلوم قائم ہوگئے اور ایک حد تک مساجد سے تعلیم کا تعلق منقطع ہوگیا *

علامہ شبلی مرحوم نے اِس موضوع پر دو رسالے لکھے ہیں اسلامی مدارس میں دوسرے دَور کے مدارس کی فہرست شائع کی ہے۔ اور مختصراً اُن کے متعلق ضروری حالات بیان کر دیئے ہیں۔ قدیم تعلیم دور اول کے متعلق ہے۔ رسالہ بہت مختصر ہے اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ دونو عہدوں میں سوائے اِس کے کوئی وجہ امتیاز نہیں کہ دوسرے دَور میں مدارس مساجد سے الگ ہوگئے۔ آلمانی مستشرق ڈاکٹر فریڈریش وُسٹنفیلٹ (DR. FRIEDRICH WÜSTENFELD) نے اسی مضمون پر ایک

جامع عربی رسالہ کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مدارس کے نام گِنوانے اور اُن کے حالات بیان کرنے کے بجائے مسلمانان قرونِ اولٰے کے نظام تعلیم پر جامع نظر ڈالی جائے۔ اس کی خصوصیات کو واضح کیا جائے۔ اور اُن کے طریقۂ تعلیم پر تفصیل کے ساتھ مبصرانہ بحث کی جائے۔ تاکہ زمانہ حاضرہ کے نظام وطریقہائے تعلیم کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اور اُن سے تعلیمی مسائل کے حل میں جو مدد ممکن ہو لی جائے۔ مسلمان اقوام میں علوم بہت جلد ترقی کر گئے۔ جو کام مسلمانوں نے دو تین سو برس میں کر دیا۔ دوسری قومیں ایک ایک ہزار برس میں نہ کر سکیں۔ اِس حیرت انگیز ترقی واشاعت علوم کا راز جبھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کے نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم سے واقفیت پیدا کریں۔ اس ضرورت کو جرمنی کے ایک دوسرے فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک (DR. DANIEL HANEBERG) نے بھی محسوس کیا اور اس رسالے سے پُورا کر دیا جس کا اُردو ترجمہ اوراق آئندہ میں قارئین کے پیش نظر ہے۔

ڈاکٹر ہانے بیرک میونک یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ آپ نے یہ رسالہ ۱۸۵۰ء میں شاہ بواریا کی سالگرہ کے موقعہ پر پڑھا۔ چنانچہ رسالہ کے اختتام پر شاہ بواریا کی تعریف اور اس کی درازی عمر کے لئے چند دعائیہ جملے بھی ہیں۔ جن کو میں نے ترجمہ سے خارج کر دیا ہے۔ رسالہ اسی سال میونک یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو گیا۔ خوش نصیبی سے

اشاعت کے اتنی مدت بعد اس کا ایک نسخہ میرے ہاتھ بھی لگ گیا۔ جو میرے پاس موجود ہے۔

رسالہ کے حسن و قبح کا اندازہ قارئین کرام خود کرلیں گے۔ مُصنف نے عام یورپی تعصبات کو یک قلم بالائے طاق رکھدیا ہے۔ اور کُشادہ دلی سے اسلامی نظام تعلیم کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بیدھڑک نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی معترف ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی برکت اور قرآن کریم کے فیض سے علوم کی جو جو خدمات کیں۔ تاریخ عالم اُن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

اِس رسالہ میں فرداً فرداً مدارس کا ذکر نہیں۔ صرف دو مضامین پر بحث ہے۔ اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی مدارس کا طریقۂ تعلیم۔ نظام تعلیم پر جامع نظر ڈالی ہے۔ اور طریقۂ تعلیم کی خصوصیات کو واضح کردیا ہے اسلوب بیان ایسا شُستہ اور ابہام سے پاک ہے کہ اس زمانے کے مدارس طلبا اور پروفیسروں کی زندہ تصویریں ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔

اِس رسالے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یُورپ کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور ڈگری پانے والے طلبا جو گون (GOWN) پہنتے ہیں۔ اور جس کا رواج یُورپ سے ہمارے مُلک میں بھی آگیا ہے۔ وہ اصل میں اسلامی مدارس سے ماخوذ ہے۔ آلمان میں سند یافتہ مدرس کو (LICENTIAT) کہتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض صوبجات مثلاً بمبئی۔ مدراس۔ یُوپی

وغیرہ میں بھی اس کو (LICENTIATE OF TEACHING) کہتے ہیں
مصنف کا دعوے ہے کہ اس لائسنس (اجازۃ) کی ابتدا بھی اسلامی
مدارس سے ہوئی اور وہیں سے یورپ نے اخذ کی - مجھے آلمانی یونیورسٹیوں
کے طریقۂ تعلیم سے کچھ واقفیت ہے - اسلامی مدارس کے طریقۂ تعلیم کا
جو نقشہ اس رسالہ میں پیش کیا گیا ہے - اس کا آلمانی یونیورسٹیوں کے
طریقۂ تعلیم کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ دونوں میں اصولی
اختلاف کوئی نہیں - دونو ایک ہیں - فرق اگر ہے - تو وہی جو امتداد زمانہ
سے پیدا ہو جانا لازمی تھا - بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی مدارس
کی زندہ مثال کہیں دیکھنی ہو تو آلمانی یونیورسٹیوں میں ہی ملے گی +

ایک اور امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے - اس رسالہ
کے مطالعہ سے پتہ لگے گا کہ مسلمانوں نے علم کی راہ میں جو جو جانفشانیاں
کیں - جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے - اور جن جن بلندیوں پر وہ پہنچے
وہ اُن کی شخصی جد و جہد اور شوق کا نتیجہ تھا - حکومت کو اس میں دخل نہ
تھا - علوم آزادی کی فضا میں ہی پنپ سکتے ہیں - حکومت جب کبھی دخل
دیتی ہے وہ مجبور ہو جاتی ہے - کہ درسگاہوں کو اپنے مصالح کے لئے
استعمال کرے - اُن لوگوں کو جو اپنی تعلیمی ترقی کے لئے ہمیشہ گورنمنٹ
کی طرف آنکھیں لگائے رہتے ہیں - اِس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے -
اور یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی ترقی اور فارغ البالی ان کی اپنی جد وجہد او
ذاتی شوق و جستجو پر منحصر ہے +

ترجمہ میں میں نے صرف اِس قدر آزادی برتی ہے۔ کہ حواشی کو جن کی طرف بار بار رجوع کرنے سے عوام کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے موزوں مقامات پر متن میں شامل کر دیا ہے۔ ان سے سِلسلۂ کلام نہیں ٹوٹتا۔ عنوان میں بھی اختصار کر دیا ہے +

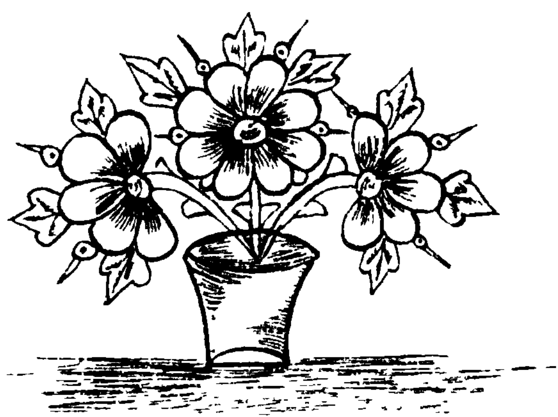

اسلامی نظامِ تعلیم

۱۔ اسلامی مدارس اور اسلام کی عالمگیر برادری

مسلمان اقوام کی تاریخ میں اُن کے مدارس اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام نے صدیوں تک ایشیا۔ افریقہ اور مغربی یورپ کی مختلف اقوام کو متحد کر کے اُن کے دلوں میں اس زبردست احساس کی لہر جاری رکھی۔ کہ وہ مختلف النوع ملکی۔ لسانی اور نسلی امتیازات و اختلافات کے باوجود ایک عالمگیر برادری کے سلسلے میں منسلک اور ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جن خیالات کی مدد سے اسلام نے یہ مقصد حاصل کیا۔ جب تک ہم اپنے آپ کو ان خیالات کی دنیا میں نہ پہنچادیں۔ ان کے مدارس اور نظامِ تعلیم کی اہمیت کو ہم پوری طرح نہیں

سمجھ سکتے +

اسلامی مدارس کے طریق کار۔ اُن کی تعلیمی جد وجہد اور اُن کی زندگی کو ہم جس قدر صحت اور صفائی کے ساتھ سمجھیں گے۔ اُسی نسبت سے ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ کہ وہ لاتعداد اور مختلف النسل اقوام کس طرح آپس میں متحد و موافق رہیں +

تاریخ تمدن کا یہ پہلو نہایت اہم ہے۔ اور حیرت ہے کہ باوجود اِس قدر اہم ہونے کے اَب تک بہت کم علماء نے اِسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے۔ بلاشبہ اس موضوع کے بعض حصّوں پر کافی محنت صرف کی گئی ہے۔ لیکن جزئیات کے متعلق کئی ایک سوالات ہیں۔ جن کی تحقیق ابھی باقی ہے۔ جہاں تک اس موضوع کی مجموعی حیثیت کا تعلق ہے۔ خود سلینؔ نے بھی اِس سے زیادہ جرأت نہیں کی۔ کہ محض ایک مختصر ساخاکہ کھینچ دے۔ اُس تصویر کو جسے بڑے بڑے اساتذہ نے شروع کیا۔ میں تکمیل تک پہنچانے کا تو دعوے نہیں کرسکتا۔ البتہ اگر میں اس میں مستقل اہمیت رکھنے والے چند ایک خط و خال کا اضافہ کرسکوں۔ تو اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھوں گا +

لہ سلین SLANE نے ابن خلکان کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کی دوسری جلد کے مقدمہ میں اسلامی مدارس کا مختصر ساخاکا کھینچا ہے مُصنف کا اشارہ اسی طرف ہے +

۲- مدارس کے درجے

مُسلمانوں کا سارا نظامِ تعلیم دو شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی مکاتب ایک طرف اور اعلےٰ تعلیم دوسری طرف۔ ایک خصوصیت جو اسلامی نظامِ تعلیم میں عام ہے۔ سب سے پہلے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ کیا ابتدائی مکاتب اور کیا اعلےٰ مدارس۔ دونوں میں وہ نظم اور ضبط جو ہمارے مدارس پر اس زور سے حاوی ہے۔ اُن میں قطعاً مفقود تھا۔ ہمارے مدارس پر گورنمنٹ سختی سے نگرانی کرتی رہتی ہے۔ اُن پر مقررہ نصابِ تعلیم کی حد بندیاں اور طرح طرح کی قانونی پابندیاں عائد رہتی ہیں۔ اِن کے خلاف اسلامی ممالک میں حکومتوں نے تعلیم کے آخری دُور میں بہت کم اور ابتدا میں بالکل کوئی حصّہ نہیں لیا۔ کیوں کہ وہاں تعلیم کی ابتدا اور مدارس کا قیام خالصتہً آزادانہ شوق کا نتیجہ تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ درس و تدریس کی کامل ترین آزادی جو ذہن میں آسکتی ہے۔ اسلامی مدارس میں اِس کی ایک نہائت شان دار مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اِس میں کیا کیا فوائد ہیں اور کیا کیا نقائص اِس کے ساتھ وابستہ ہیں +

۳- قرآن کا اثر

جہاں جبری تعلیم کا قانون نہ ہو- وہاں درس وتدریس کا شوق زیادہ تر مذہب پر مبنی ہوتا ہے- قرآن (کریم) نے کئی قوموں پر وہ روحانی اثر ڈالا- کہ اُن میں قرآن (کریم) کے پڑھنے کا آزادانہ شوق پیدا ہو گیا- اور اسی شوق نے کسی خارجی اثر یا حکومت کی تحریک کے بغیر ابتدائی مکاتب پیدا کر دیئے +

۴- تعلیم کا عالمگیر چرچا

یہ نہیں کہ صدیوں کے بعد ہمیں ہر ایک گاؤں میں مسجد کے اندر یا مسجد سے ملحق ابتدائی تعلیم کے لئے ایک سکول نظر آئے- نہیں- بلکہ تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی اس قسم کی تعلیم کا انتظام موجود تھا اور نہ صرف عرب اور عراق بلکہ دُور دُور کے صوبوں میں بھی تھا- مثال کے طور پر خلافت عباسیہ کے بانی ابومسلم کو دیکھ لو- وہ بچپن میں خراسان کے ایک اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے- دوسری صدی ہجری کے آخر میں ایران کے شہر شوستر میں ہمیں نہ صرف ایک اسکول قائم نظر آتا ہے- بلکہ نصاب تعلیم کے اختتام تک اس میں تعلیم جاری رکھنا سرکاری جبر کے بغیر قانون بن گیا تھا ایک مشہور صوفی کے متعلق جو بچپن میں اس اسکول میں پڑھا کرتا تھا- بیان کیا جاتا ہے- کہ اس نے دوسرے لڑکوں سے پہلے اسکول چھوڑ دینا چاہا- تو

اُس کے لواحقین نے اُستاد سے اجازت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ استاد کی اجازت کے بغیر سکول چھوڑنا ممکن نہ تھا +

جن والدین کو اپنے فرض کا احساس ہوتا تھا وہ اپنے بچّوں کو مذہبی تعلیم گھر میں بھی دیتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی جس کے نام کی دھوم مشرق و مغرب میں آج تک ہے۔ اکثر دیکھا گیا۔ کہ اپنے بچّوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ کتاب عقائد ہاتھ میں ہے اور اُن کو پڑھا رہا ہے +

صوفی مذکور کے واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لڑکا چھ برس کی عمر میں مکتب چلا جاتا تھا۔ جب معلم کسی جماعت کی طرف سے مقرر ہوتا تھا تو غربا کے بچے بھی تعلیم سے مفت فائدہ اُٹھاتے تھے۔ بلکہ غلام بھی درس میں حصہ لیتے تھے جن کی مثالیں موجود ہیں۔ گو عام طور پر یہی خیال پھیلا ہوا ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ اناث کا درجہ مردوں سے کم ہے۔ لیکن (شیخ) سعدی (علیہ الرحمتہ) کی گلستان[۵] سے صاف عیاں ہے کہ بعض ممالک میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ مکتب جاتی تھیں +

الف لیلے میں ایک اسکول میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ علم حاصل کرنا مسلمان عورتوں پر بھی فرض ہے طَلَبُ الْعِلْمِ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ فَرِیْضَۃٌ +

---

[۵] گلستان باب ہفتم۔ حکایت نمبر ۲۰۔ پسران پاکیزہ و دختران دوشیزہ +

۵۔ تربیت اخلاق

اسلام نے متعدد اور دُور دراز ممالک میں ہزاروں اور لاکھوں ابتدائی مکتب پیدا کر دیئے۔ گو اِن سکولوں کا دائرہ عمل ایک حد تک تنگ ہوتا تھا اور طریقۂ تعلیم میں سختی بھی ہوتی تھی۔ تاہم اِس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے حقیقی انسان دوستی کا بہت بڑا نمونہ پیش کر دیا۔ ان ابتدائی مکاتب میں بلاشبہ بہت سختی ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت (شیخ) سعدی (علیہ الرحمۃ) کی گلستان سے بھی مل سکتا ہے۔ سعدی ایک خوش طبع اور انسان دوست آدمی تھا۔ لیکن وہ بھی ایک حلیم الطبع معلم پر ایک ایسے معلم کو ترجیح دیتا ہے جو "ترش روئے و تلخ گفتار۔ بدخوئے و مردم آزار تھا کہ عیشِ مسلمانان بدیدنِ وے تباہ گشتے"۔

جو سزائیں اولیاریوس (OLEARIUS) ایک جرمن سیاح نے ایران کے سکولوں میں دی جاتی دیکھی تھیں۔ اور جن کی اُس نے ایک تصویر بھی بنوائی تھی۔ اگر وہ دستور عام کی حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ تو ہمیں کہنا پڑے گا۔ کہ اسلامی مکاتب میں بچوں کی محبت کو راہ نہ تھی۔

تربیت اخلاق میں اصولِ تعلیم کا احساس بھی پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اور علماء کے درمیان یہ بحث تھی۔ کہ جو بات انسان میں فطرتاً موجود نہ ہو۔ آیا وہ تربیت سے اس میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ یا تربیت سے محض اُن خصائص کو ہی ترقی دی جا سکتی ہے۔ جن کو وہ بطنِ مادر سے اپنے ساتھ

لایا ہو۔ علماء (شیخ سعدی (علیہ الرحمۃ) کے اُس اصول کے پوری طرح قائل تھے۔ جسے شیخ نے گلستان کے آغاز میں ہی ایک بادشاہ کی زبانی یوں بیان کر دیا ہے۔ یعنی ع

ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

لیکن یہ اُصول تعلیم و تعلم کے شوق کو کسی طرح بھی کم نہ کر سکا۔

۶۔ ابتدائی مکاتب کا نصاب

ہر ایک قسم کی سختی اور ہر طرح کے حوصلہ شکن تجارب کے باوجود اسلام نے تعلیم کے شوق کو زندہ رکھا۔ اور ابتدائی تعلیم کے محدود نصاب سے تعلیم میں جن نقائص کے پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ اُن کا سدِ باب کر دیا۔

نصاب بہت محدود تھا۔ سب سے اوّل ضروری تھا۔ کہ قرآن شریف اِتنا سکھا دیا جائے جو دینی ضروریات اور فرائض کی ادائیگی کے لئے کافی ہو۔ لڑکے قرآن پڑھنا سیکھتے تھے۔ اُن میں جو قابل ہوتے تھے وہ چند سورتیں زبانی یاد کر لیتے تھے۔ اکثر ایسے تھے جو سارے کا سارا قرآن شریف حفظ کر لیتے تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ تحریر کا فن بھی سیکھتے تھے۔ بلکہ فنِ تحریر کی بنا پر ہی ابتدائی سکولوں کا نام مکتب رکھا گیا تھا۔ کم از کم عراق کے مکتبوں میں تحریر کی مشق معمولی کاروباری ضروریات سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔

اسلام نے فن لطیف یعنی مصوری کو ممنوع قرار دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جوہرِ قابل نے خطاطی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ اور رسم الخط میں نئی نئی ایجادیں اور طرح طرح اندازیاں کی گئیں۔ یہاں تک کہ مفتیوں کے خشک فتووں کی قیمت ان کے حسنِ تحریر کے مطابق پڑنے لگی +

معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ اور مراکش میں ابتدائی مکاتب کا نصاب اس سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ وہاں کا رسم الخط اب تک ہی ابتدائی کوفی رہا ہے۔ ابن خلدون نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مکاتب کا جو معیار ابتداء اسلام میں تھا۔ مراکش میں علامہ موصوف کے زمانے تک وہی قائم تھا۔ دوسرے ممالک بالخصوص اندلس میں صرف و نحو بھی پڑھائی جاتی تھی اور قدیم عربی اشعار کے ذریعہ اس کے قواعد بیان کئے جاتے تھے۔ ایران خراسان۔ ماوراء النہر وغیرہ مشرقی ممالک میں عربی گرامر کی تعلیم لازمی تھی لیکن اس کے ساتھ کم از کم تیرھویں صدی (ساتویں صدی ہجری) سے فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ خود سعدی کے زمانے میں اعلےٰ جماعتوں کے طلباء جہاں مقدمہ نحو زمخشری پر مغز زنی کرتے تھے۔ وہاں فارسی اشعار میں بھی خاص دلچسپی لیتے تھے۔ ان ممالک میں سعدی اور حافظ کو صدیوں سے وہ منزلت حاصل ہے۔ جو ہمارے ہاں نیپوس (NEPOS) اور ہوریس (HORACE) کو ہے +

ابتدائی مکاتب میں گرامر کی تعلیم کے اجزاء سے خالص مذہبی تعلیم کی مطلق العنان حکومت میں بہت حد تک کمی ہو گئی۔ لیکن اعلےٰ تعلیم میں مذہب

کا اثر ورسوخ ویسے کا ویسا ہی رہا۔

اعلےٰ التعلیم

اعلےٰ تعلیم سے مراد اوّل اوّل محض فقہ تھی۔ اور فقہ کی بنیاد قرآن شریف حدیث اور قیاس پر ہے۔ اِن ہی سے قانون اسلام تمامتر اخذ کیا گیا ہے۔ علم فقہ نے بعد کے زمانوں میں بھی نہ صرف اولیت کا دعوےٰ کیا ہے بلکہ ہمیشہ کوشش کی ہے کہ علوم کی دوسری شاخوں کو یا تو اپنے ماتحت رکھے یا کم ازکم اہمیت میں اپنے برابر نہ ہونے دے۔

آٹھویں صدی (دوسری صدی ہجری) میں اسلامی دُنیا کے ایک سربرآوردہ عالم کا ذکر ہے کہ اُس نے بڑے تذبذب کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ فقہ کے علاوہ جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے۔ اور جو روحانی صحت کا باعث ہے۔ طِبّ بھی علم کی ایک شاخ ہے جس سے جسمانی صحت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے علاوہ اس نے باقی سب علوم کو بلغة المجلس یعنی تفنن طبع کا سامان قرار دیا۔

اس قسم کا غیر مہذب نظریہ تہذیب وتمدن کی رفتار کو نہیں روک سکتا تھا بہت عرصہ نہیں گذرا تھا کہ علم لغت ومعانی (فلالوجی) کے فریفتہ اور خادم بھی پیدا ہوگئے۔ اگرچہ وہ تعداد میں فقیہوں کے برابر نہ تھے۔ تاہم قابلیت کے لحاظ سے اُن سے کچھ کم نہ تھے۔ اِس کے علاوہ ریاضی اور دوسرے معقولی علوم بھی پیچھے نہ رہے۔ لیکن یہ سب علوم زیادہ تر شریعتِ مقدسہ کی خدمت

کے لئے پیدا ہوئے۔ اور جو علوم بعد میں پیدا ہوتے گئے۔ مذہب نے ان سب پر اپنا پدری حق قائم رکھنے کی کوشش کی۔ دُنیاوی علوم کے شوق میں بھی اکثر کوئی دینی غرض پنہاں ہوتی تھی۔ مثلاً ایک صاحب عبداللہ بن مبارک کا ذکر ہے۔ جنہوں نے اپنے باپ سے ساٹھ ہزار درم ورثہ میں پائے تھے۔ انہوں نے نصف روپیہ فقہ اور نصف علم نحو کی تحصیل پر خرچ کردیا۔ لیکن بعد میں کہنے لگے۔ بہتر ہوتا کہ میں کل روپیہ لغت و معانی کی تحصیل پر صرف کردیتا۔ کیونکہ عیسائی صرف ایک حرف کے چھوڑ دینے سے گمراہ ہوگئے۔ اِنجیل میں لکھا تھا ولّدت یعنی میں نے عیسٰی کو پیدا کیا۔ اس کی جگہ عیسائیوں نے تشدید کو حذف کرکے ولدت یعنی میں اس کا والد ہوں پڑھ لیا!

بعد میں جب دوسرے علوم ترقی کرتے کرتے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے تو مذہب کے ساتھ تعلق رکھنے والے علوم کی فوقیت و حکومت ان پر محض برائے نام رہ گئی۔ لیکن مذہب کا اثر پھر بھی کلی طور پر زائل نہیں ہؤا۔ اور اگر ہم مذہبی اثر کو نظر انداز کردیں تو مُسلمان اقوام کے نظامِ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت کو نظر انداز کر بیٹھیں گے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ اسلام ترقی علوم کی راہ میں روک بن گیا غلط اور اسلام کے ساتھ بے انصافی ہے۔ اس زمانے میں مسلمان اقوام کے درمیان تحصیل علوم کا بے نظیر عشق جس کی وسعت اور عالمگیری کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ ان کے درس و تدریس کی حکومت کی

پابندیوں سے کامل آزادی - اُن میں علوم کی حیرت انگیز اشاعت اور اسلامی مدارس کی زندگی بخش اور اُن تھک کوششوں کو اسلام کے اثر سے بے نیاز نہیں سمجھا جا سکتا +

روز اوّل سے ہی اسلام نے مسجد و کو اعلٰے تعلیم کے لئے وقف کر دیا

۷ - مساجد کے استعمال

مسلمانوں کے نزدیک مسجد کو وہ (غلط) تقدس حاصل نہیں جو عیسائیوں کے ہاں گرجے کو حاصل ہے - یقیناً مسلمان مساجد کا احترام کرتے ہیں - لیکن اگر نماز کے علاوہ مساجد سے کوئی دوسرا نیک اور پاکیزہ مقصد بھی حاصل ہو سکے تو مسجدوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے میں بالکل دریغ نہیں کرتے - چونکہ بچوں کی تعلیم و تربیت ہر ملک و قوم میں ایک مقدس شے مانی جاتی ہے اس لئے کوئی حیرت کا مقام نہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچوں کے مکتب اکثر مسجد میں ہوا کرتے تھے - اور اب بھی ہیں - غریب بیکس مسافر اکثر مسجد میں ہی ٹھہرتے ہیں - مریضوں کے قیام کے لئے مساجد میں انتظام ہوتا ہے - اکثر اوقات جماعت کے لئے مسجد دربار عدالت کا کام بھی دیتی ہے - کیونکہ عدل و انصاف بھی ایک مقدس فعل ہے - نظامیہ بغداد کا مشہور

پروفیسر ابو اسحاق شیرازی اکثر مسجد میں ہی کھانا کھاتا تھا۔ لیکن اسلام میں تقدس کے لحاظ سے نماز سے دوسرے درجہ پر علم ہے۔ نہیں۔ بلکہ علم کو اندھے مقلدانہ زہد پر فوقیت حاصل ہے، اسلام میں ایک مخلص اور باعمل فقیہہ ایک ہزار نماز گذاروں کی نسبت شیطان پر زیادہ قوت رکھتا ہے۔ انہی خیالات کا نتیجہ تھا کہ سب سے پہلے فقہی مسائل کی عالمانہ بحثوں کے لئے مسجدوں نے اپنے دروازے شوق سے کھول دیئے۔ فقہ کا علم ایک سمندر ہے جس کی حد و انتہا نہیں۔ علم فقہ کی اس بے پایاں وسعت کے طفیل بہت جلد مساجد میں ایسے علوم کا داخلہ ہو گیا۔ جنہیں بادی النظر میں مذہب کے ساتھ دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک ہی گنبد کے نیچے عبادت گذار نماز پڑھتے تھے۔ اور علم اللسان کا ایک ماہر کسی شاعر کے کلام پر لیکچر دیتا تھا۔ حریری کا نام یورپ میں معروف ہے۔ یہ شاعر بصرے کی ایک مسجد میں اپنی مذہبی مذاق کی نظموں پر لیکچر دیا کرتا تھا۔

۸۔ مساجد اور تعلیم کا گہرا تعلق

ہر ایک شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ کافۂ انام کے سامنے لیکچر کرنے یعنی اعلےٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کا انتظام اس سے کس قدر آسان ہو گیا۔ تعلیم کے لئے بڑی بڑی گراں قیمت عمارتیں کھڑی کرنے کی ضرورت نہ رہی مذہب اسلام نے خود خندہ پیشانی اور دریا دلی سے اس کا انتظام کر دیا۔

لیکن جب کسی عالم کا ذکر آئے کہ اُس نے فلاں فلاں مسجد میں درس دیا۔ تو اس سے ہر دفعہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ لیکچر اسی ایک گنبد کے نیچے دیئے گئے ہوں گے جس کے نیچے لوگ نماز ادا کرتے تھے۔ بڑی مسجدوں میں الگ بڑے بڑے ہال کمرے اور ملحقہ مکانات ہوُا کرتے تھے۔ اور اَب بھی ہیں جن سے تعلیم و تدریس کا کام لیا جاتا تھا +

۹۔ نشر و اشاعت

لیکن ہر حال میں تعلیم کا مسجد سے چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اور اس تعلق کی وجہ سے لیکچروں کی اشاعت آسان ہو جاتی تھی۔ اور نشر علوم میں بے حد مدد ملتی تھی۔ تعلیم عامہ پر مذہب نے جو منفعت بخش اثر ڈالا۔ یہ اُس کی دوسری مثال ہے۔ عوام اور اساتذہ کے درمیان کوئی بُعد نہ رہتا تھا۔ کوئی چیز اُن کے درمیان حائل نہ رہتی تھی۔ اگر لیکچر مسجد میں ہوں اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا تو سامعین استاد کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہر ایک بھلا آدمی بلا امتیاز اس حلقے میں شامل ہو سکتا تھا۔ البتہ اُستاد سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اور اجازت سے صرف اسی صورت میں انکار کیا جاتا تھا۔ جب لیکچر کا موضوع ایسا ہو جس پر علماء میں تلخی آمیز بحثیں شروع ہو جائیں۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اس تعلق میں علامہ ابن خلکان نے امام محمد بن یحییٰ کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے اپنے لیکچروں میں شریک ہونے کی ہر اُس شخص کو ممانعت کر دی تھی جو اُن کے حریف اور

مدِ مقابل امام بخاری کی رائے کا پیرو ہو۔ اس طریق تعلیم سے حلقہ کا لفظ اِتنا رائج ہوُا کہ ہوتے ہوتے سامعین کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگا +

جو لیکچر مسجد کے ملحقہ کمروں میں ہوتے تھے اُن کا بھی یہی دستور تھا۔ بلاشبہ حلقے میں شامل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑتی تھی مثلاً جیسا کہ ابنِ خلکان نے ذکر کیا ہے۔ حاتمی نے متنبی کے لیکچر ہال میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کی۔ لیکن کئی مدرس لیکچر دیتے وقت دروازے کھلے رکھتے تھے اور عام اجازت تھی کہ جو چاہے حلقۂ درس میں شامل ہو جائے۔ صرف چودھویں صدی (آٹھویں صدی ہجری) کے ایک مدرسہ کا ذکر غیر معمولی واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اس کے دروازوں پر پولیس کا پہرہ تھا۔ قاہرہ میں مدرسہ ناصریہ چودھویں صدی (آٹھویں صدی ہجری) میں قائم ہوُا۔ اور اُس کے دروازے پر پولیس (طواشیہ) کا پہرہ بٹھایا گیا۔ علامہ مقریزی نے دیکھا تو حیرت ہوئی۔ یہ روایت ثابت کرتی ہے۔ کہ عام طور پر حلقے میں شریک ہونا آسان تھا اور اجازت حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی +

۱۰۔ اساتذہ پر نقد و جرح

مدرسین کا دستور تھا کہ اعتراضات سنتے تھے۔ لیکچروں کے موضوع پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ اور ہر ایک اُستاد نکتہ چینی سننے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اِس دستور کا اثر بے حد فائدہ مند تھا۔ اور اُستاد سبق کے لئے وقت

کے ساتھ پوری پوری تیاری کر کے آتے تھے۔ ایسے واقعات بھی تاریخوں میں موجود ہیں۔ کہ ایک نوعمر اُستاد جو خود ابھی درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچا مسجد میں ایک فاضل کے سوالات سے عاجز آکر مسند درس سے مستعفی ہو جاتا ہے اور اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن فضلا کی محض موجودگی بھی خواہ وہ خاموش ہی رہیں مدرسین کی حوصلہ افزائی اور ولولہ انگیزی کا باعث ضرور ہوتی ہوگی۔ اِس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں مذہب نے تعلیم پر کچھ پابندیاں لگا دیں۔ وہاں اُن کے عوض فوائد بھی بے حد پہنچائے۔ اور سب سے زیادہ اِس طرح کہ تعلیم و تدریس کو مسجدوں اور اُن کے ملحقہ مکانات کے ساتھ وابستہ کر کے پبلک کے ساتھ اس کا مستقل تعلق قائم رکھا +

۱۱۔ مسلمانوں کا شوق سیاحت

جو لوگ علم کا شوق اور تعلیم و تعلم سے شغف رکھتے تھے ان کا باہمی میل جول جس میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی تھی۔ اور جو ہر قسم کے تمدنی اِمتیازات سے بالا ہوتا تھا۔ علوم کی ترقی کے لئے ہر حالت میں حوصلہ افزا اور سودمند ہوتا ہوگا۔ لیکن اس میل جول کے علاوہ تاریخ اسلام میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو جہاں تک مجھے علم ہے باقی دنیا کی تاریخ میں ہرگز نہیں پائی جاتی اور جس نے علمی شوق و جستجو کو بے حد وسعت دے دی۔ میری مراد اس شوق سیاحت سے ہے جو مُسلمان اقوام میں بہت عام رہا ہے اور جس کی بر کت

سے ہر بڑی مسجد میں مسافر چار دانگ عالم سے آ آ کر اترتے رہتے تھے - اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اسلام نے براہِ راست سیاحت کا شوق پیدا نہیں کیا - تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ مسجدوں کو مدارس بنا کر اسلام نے سیاحت کے شوق کو علم کے لئے فائدہ مند ضرور بنا دیا +

لیکن مذہب کو اس معاملے میں بھی نزدیک کا واسطہ تھا - حج اسلام کا ایک فریضہ ہے - اور اس فرض کے ادا کرنے کے لیے ہر سال ہزارہا لوگ دُور دراز ممالک سے مکہ معظمہ کو آتے تھے - جن میں علم کے طالب اور فاضل اجل بھی ہوتے تھے - جو شخص مشرقِ اقصلے سے ہزار ہا کوس کی مسافت طے کر کے آتا تھا - وہ بلا کسی مزید تکلیف کے بغداد کے مدارس میں ہو کر جاتا تھا - اور جب وہ یہاں تک آ چکتا تھا تو اُس سے یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا - کہ دمشق کے فضلا کا درس سنے بغیر واپس چلا جائے - اور ان میں سے اکثر اپنے علمی سفر میں مصر کو بھی شامل کر لیتے تھے - دوسری طرف افریقہ اور مغرب (مراکش) سے آنے والے مشرق کے مدارس (یعنی دمشق اور بغداد وغیرہ) کو دیکھے اور اُن کے لیکچر سنے بغیر واپس نہیں جاتے تھے +

۱۲ - جمع حدیث

اِس دینی غرض کے علاوہ بعض علوم ایسے تھے جن کی تکمیل بغیر سیاحت کے نہیں ہو سکتی تھی - روایت حدیث میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ تھی - (حضرت) محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و اعمال اسلام میں فرائض دین

کا معیار ہیں۔ ان کا دریا بڑھتے بڑھتے ایک سمندر بن گیا۔ لوگوں کو پتہ لگا کہ بعض لوگوں نے دیدہ ودانستہ موضوع حدیثیں پھیلا رکھی ہیں۔ مثلاً ایک یہودی نے جعلی حدیثوں کا ایک طومار پھیلا دیا تھا۔ بعض راویوں کو جھوٹا قرار دینا پڑا۔ جن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو علم کے راستے میں بڑی بڑی سیاحتیں کر چکنے کے مدعی تھے۔ اِس لئے ان بزرگوں نے جن کے سینوں میں اسلام کا جوش اور جن کے باطن خلوص سے معمور تھے نہایت مشقت خیز سیاحتیں کیں اور دنیا کے جس حصے میں بھی ان کو حدیث کے کسی ذخیرے کا پتہ لگا وہ مردانہ وار وہاں پہنچے۔ ہمارے دلیر سے دلیر محققین علم الحیلوۃ کی قربانیاں زمانہ قدیم کے ان حدیث جمع کرنے والوں کے جوش وہمت کا کچھ کچھ پتہ دے سکتی ہیں جمع حدیث کے عشق نے مشہور عالم امام بخاریؒ کو اپنے ترکستانی وطن سے نکالا اور نہ صرف بغداد تک لایا جو اُس وقت علم حدیث کا مرکز بنا ہوا تھا بلکہ وسط عرب کے ریگستانوں میں پھرا کر آخر مصر وشام کی بادیہ پیمائی کرائی۔ گو امام موصوف نے ہزاروں حدیثیں ناقابل قبول سمجھ کر ترک کردیں تاہم سولہ سال کی غریب الوطنی اور محنت شاقہ کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہمارے لئے ساٹھ ہزار احادیث کا ایک بے نظیر مجموعہ چھوڑ گئے۔ ایک صاحب ابوالقاسم نامی نے تیرہ سو حدیثیں جمع کیں اور اپنی سیاحتوں میں جمع حدیث کا یہاں تک تردد کیا۔ کہ جن عورتوں سے آپ نے اِستفادہ کیا صرف اُن کی تعداد اَسّی تک پہنچتی ہے۔ اسماء رجال کی کتابوں مثلاً

ابن خلکان۔ نووی اور ذہبی وغیرہم میں اس قسم کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں۔ ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مذہبی شوق تحقیق کا جوش کن بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس شوق کو پورا کرنیکے لئے مسلمانوں نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائیں۔

۱۳۔ لغت ومعانی کی تحقیق

لغت ومعانی کی تحقیق کے لئے سیاحت کا شوق بھی ابتداء میں مساعی دین کے ساتھ وابستہ تھا۔ وسط عرب کی زبان قرآن کریم کی زبان ہونے کی وجہ سے عربی بلاغت کا معیار بن گئی تھی۔ اس لئے لغت و معانی کے سب سے پہلے محقق اسی کوشش میں رہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو بدویوں کے ساتھ میل جول پیدا کریں تاکہ ان کے کلام کی پیچیدگیوں اور معانی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کرنیکے لئے اُن کے قومی اشعار سیکھیں۔ زبان کی تحقیق کا شوق رکھنے والے ہندوستان تک سے آتے تھے۔ صحرائے عرب کے فرزندوں کے گھر پہنچنے کا شوق اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ بدوی لوگ کاروانوں پر حملہ کرتے۔ انہیں لوٹتے بعض مسافروں کو قتل کرتے اور بعض کو پکڑ کرلے جاتے تھے لیکن زبان کی تحقیق کے شائق اسے بھی خوش نصیبی شمار کرتے تھے محمدؐ ازہری جو لغت ومعانی میں خاص پایہ رکھتا ہے۔ اسی طرح کرامتیوں کے ہاتھ اسیر ہو کر بدویوں کے ہاں پہنچا۔ اور اس خوش نصیبی پر بے حد

نازاں تھا۔

زبان کی تحقیق کے لئے سیاحت کے اس شوق کا تعلق مذہب کے ساتھ بعد میں بھی قائم رہا۔ کیونکہ قرآن کی عظمت وعزت اور اس کی زبان سیکھنے کی خواہش طالبوں کو کشاں کشاں وسط عرب کی طرف ہی لے جاتی تھی۔ گو آہستہ آہستہ بدویوں اور اُن کے نقالوں کے اَدبی ذخیرے کا مطالعہ قرآن کی متداولہ تفاسیر سے قطعاً الگ ہو کر بجائے خود ایک مستقل علم بن گیا لیکن پھر بھی تحقیق زبان کی ان مُہموں نے مُسلمان طلبا اور اساتذہ کی زندگی اور علمی جستجو میں سیاحت کا وہ شوق پیدا کر دیا تھا جو اِسلامی نظامِ تعلیم کے نہایت درخشاں خصائص میں شمار ہوتا ہے۔ ایک نوجوان اپنے پیدائشی قصبے میں ابتدائی مکتبی تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد جب پندرہ برس کا ہوتا تھا تو قریب کے کسی بڑے شہر کے اساتذہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتا تھا۔ اور اکثر اوقات اس وقت تک آرام نہیں لیتا تھا۔ جب تک کہ مشرق و مغرب کے مدارس سے فیضیاب نہ ہو لیتا تھا۔ بعض اوقات پختہ عمر آدمی بھی علم کے شوق میں گھر سے نکل پڑتے اور شہر بشہر اور ملک بملک پھر نکلتے تھے۔ بعض اوقات کسی دُور افتادہ ملک کے کسی بلند پایہ عالم کی شہرت ایسے لوگوں پر بھی مقناطیسی اثر رکھتی تھی جو خود درس دے چکے ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ اساتذہ کے لیکچروں میں پختہ عمر آدمی بلکہ وہ لوگ بھی جو خود علم وفضیلت کی دنیا میں شہرت حاصل کر چکے ہوتے تھے حصّہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن خلکان کا بیان ہے۔ کہ اشعری نے مروزی کے لیکچر سنے

ایک پرائیویٹ معلم کا بھی ذکر کیا ہے جو لیکچر سنا کرتا تھا۔ چونکہ تمام علمی مباحث اور لیکچروں کی زبان عربی تھی۔ اِس لئے ہر نووارد اسلامی ممالک کی تقریباً نا متناہی وسعت میں جہاں جاتا ہر مسجد اور ہر لیکچر ہال میں دوسروں کی سمجھ سکتا اور اپنی سمجھا سکتا تھا۔ طالبعلموں اور سیاحت کے شوقینوں حق کے متلاشیوں اور شہرت کے خواہشمندوں کی اس نہ رکنے والی جہانگردی نے اسلامی نظام تعلیم سے یک رنگی کو دُور کر کے مذاق میں گوناگون جدتیں پیدا کر دیں۔

نئے خیالات کی اشاعت کے لئے ادبی رسائل کی ضرورت نہ تھی۔ سیاح طلبا اساتذہ کی اچھی بُری شہرت کے ساتھ اُن کی آرا بھی دُور دُور پہنچا دیتے تھے۔ علم الٰہیات اور فلسفہ کے مختلف مسائل پر وہ آزاد اور شُستہ آراء جو فلسفۂ یونان کے اثر سے تیسری صدی ہجری کے بغداد میں عام ہو گئی تھیں۔ جس حیرت انگیز سرعت سے ایک ساتھ تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئیں۔ ان کی اشاعت اسی طرح ہوئی تھی۔ قشیری کے بیان سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ مشرقی صوبہ خراسان میں جو شخص پہلے پہل یہ خیالات لے کر آیا۔ اُس کا خیر مقدم کیونکر کیا گیا۔ اور دوسری طرف کس طرح مکّہ (معظمہ) والوں نے ایک فاضل سیاح سے جو پہلے مکّہ (معظمہ) میں رہ چکا تھا لیکن اس کے بعد بغداد میں رہ کر اپنے عقائد سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا سُنا کہ بغداد میں علم دین کا ایک نیا آفتاب بلند ہوا ہے۔ اس کے الفاظ تھے اَسْلَمْتُ اِسْلَامًا جَدِیْدًا میں نے ایک نیا اسلام اختیار کیا ہے۔

۱۴۔ بحث و مجادلہ کا شوق

بلاشبہ کہنا پڑتا ہے کہ اجنبی اور دُور دُور کا سفر کرنے والے علما کے باہمی میل جول کا ایک اثر یہ ہُوا کہ بحث و مجادلہ کی خواہش پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ کئی اعتبار سے اچھا نہ تھا۔ مسجد میں ایک شخص کھڑا ہو کر پکارتا تھا کہ حاضرین میں سے کوئی شخص کسی علم کا سوال کرے۔ سوال ہُوا اور اسپر فوراً بحث شروع ہوگئی (قز دینی)۔ ادبی مباحث میں شہرت حاصل کرنے کی خواہش بالخصوص اس لئے بھی قوت پکڑ گئی ہوگی کہ علم دوست حکام اور علما کے صاحب جاہ سرپرست اکثر پبلک بحثوں میں خود شریک ہوتے تھے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جب صرف علما ہی موجود ہوتے تھے۔ جو بحث کے دُوران میں اپنی آرا کو ہر طرح صحیح ثابت کرنے یا فرقہ بندی کے جوش سے اندھے ہو جاتے تھے۔ تو ایسے مواقع پر بھی فساد تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ عالمانہ صحبتوں کی یہ خوبی تھی کہ آپس کی نوک جھونک میں بھی لطافت بیان اور عالمانہ انداز قائم رہتا تھا۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ ایک فریق اپنے پیروؤں کو دست درازی پر اکسائے۔ سُنیوں کے چوتھے فرقہ کے بانی امام احمد حنبل کے پیروؤں نے جو تنگ نظری اور خودسَری میں قرن بہ قرن گیارھویں صدی تک اپنے اُستاد سے سبقت لے جاتے رہے۔ بغداد اور دوسرے مقامات پر بار بار فساد برپا کئے۔ جن میں خُون ریزیاں بھی ہوئیں۔ جب اختلاف آرا تہذیب و شائستگی

کی حدود سے یوں تجاوز کر جائے تو اعلےٰ علمی مسائل و مباحث میں عوام کی شمولیت سے افسوسناک نتائج ہی مترتب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ عوام میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ کہ ٹھنڈے دل سے اختلاف کے وجوہ پر غور کریں۔ ممتاز اساتذہ کے لیکچر سننے والوں کا شوق بھی بعض اوقات تعصب پر مبنی ہوتا تھا۔ مثلاً بقول نووی جب محمدؒ بن ابی الحسن مالکی شریعت پر لیکچر دیتے تھے تو سامعین گروہ در گروہ آتے تھے۔ لیکن جب لیکچروں کا موضوع کسی دوسرے امام کی فقہ ہوتی۔ تو سُننے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ خلفاء بنی عباسؓ کو اس بات کا بے حد احساس تھا۔ اور انہوں نے آٹھویں صدی (دوسری صدی ہجری) میں بہت کوشش کی کہ مسائل تقدیر اور خلق قرآن کو زیادہ معقول طریقہ پر پیش کریں۔ لیکن آخر میں انہیں بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے رائے عامہ پر جبر کرنا چاہا۔ وہ خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے جبر و زیادتی نے مخالفوں میں حق کی حمایت اور اخلاق کی پاکیزگی کا جذبہ زیادہ قوی کر دیا۔

۱۵۔ باہمی رواداری

اعلےٰ اسلامی مدارس کے حلقۂ درس میں شرکت کی عام اجازت میں یہ نقائص تھے۔ لیکن اسے بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ اہم ترین مذاہب کے

پہلے تین بانیوں یعنی امام ابوحنیفہ ۔ امام مالک اور امام شافعی نے رواداری ۔ مروت ملائمت اور بُردباری کی نہایت خوب صورت مثال پیش کی ہے ۔ حالانکہ علمی آرا اور طریقہ تعلیم میں تینوں بزرگ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے ۔ امام شافعی اور امام مالک میں نہایت گہرا اور دوستانہ میل جول رہا ۔ اور مصر میں ان دونوں کی ملاقات نے مستقبل کے لئے ان کے مذاہب کے درمیان موافقت ۔ تحمل اور تعاون کا دائمی نمونہ قائم کر دیا ۔ ہمعصرانہ تفاخر کا احساس ایک حدتک چاروں مذاہب میں رہا ۔ مالکی اور شافعی حنفیوں کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ راسخ العقیدہ سمجھتے تھے ۔ حنفیوں کو اہل الرائے اور اہل القیاس کہہ کر طعن دی جاتی تھی ۔ جسے انہیں قبول کرنا پڑا ۔ جب ایک مذہب کا کوئی ممتاز رکن دوسرے مذہب میں چلا جاتا تھا تو دوسرا فرقہ اسے اپنی فتح نمایاں گردانتا تھا ۔ لیکن یقین کا احترام ہوتا تھا ۔ اور محض مادی منفعت کی خاطر مذہب بدل لینا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ اختلافی مسائل پر بہت کتابیں لکھی گئیں ۔ نظامیہ بغداد میں اختلافی مسائل بعد میں ایک مستقل علم بن گئے ۔ اور ایک پروفیسر اس کے درس کے لئے بھی مقرر ہو گیا ۔ اختلافی مسائل کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے ۔ کہ ہر ایک فرقہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ وہی لوگ اس میں شامل ہوں جو اختلافات کو سمجھتے اور اُس کی اپنی آراء کو دل سے مانتے ہوں ۔ ادب کا یہ ذخیرہ کیسا ہی نکما اور بے سود کیوں نہ ہو ۔ اِس سے اِتنا تو پتہ چلتا ہے ۔ کہ اختلاف آراء نے ان لوگوں میں بحث کی قابلیت بدرجۂ اتم پیدا کر دی تھی ۔ اور اس ڈر سے

کہ معاصر کی نگاہ میں ذلیل نہ ہو۔ ہر ایک شخص حاضر جوابی کے تمام ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

۱۶- کتابوں کی فراوانی

جہاں اس میں شبہ ہے کہ حلقۂ درس میں عوام کی آزادانہ شرکت سے کشتِ علوم کی آبیاری پر مفید اثر پڑا ہو۔ اس میں بھی کلام ہے کہ تحریر پر یاد کو ترجیح دینا اور ہر ایک علم کا قوت حافظہ کے سپرد کر دینا مفید ثابت ہوا ہو۔ اسلامی طریقِ تعلیم کی اس خصوصیت کا سبب کتابوں کی کمی تھی۔ اگر یہی وجہ ہوتی تو از منۂ بعد میں اس کی ضرورت نہ رہتی۔ کتابوں کی کمی نہ تھی۔ پہلی صدی ہجری میں بھی ہمیں ایسے علماء نظر آتے ہیں۔ جن کی بیویوں کو کتابوں کی کثرت کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی اور ایک صاحب جاحظ نامی تو کتابوں کے ڈھیر کے نیچے ہی دب کر مر گئے۔ اسلام کی ابتدا میں ہی کتابوں کا جمع کرنا عزت و افتخار کا سرمایہ سمجھا جانے لگا تھا۔ اور نہ صرف علماء بلکہ اعیانِ حکومت بھی اس افتخار میں شریک تھے۔ ایک وزیر کا ذکر ہے کہ جب سفر پر جاتا تھا تو کتابوں سے لدے ہوئے تیس اونٹ ساتھ ہوتے تھے۔ بے شمار کاتب جن میں سے بعض لغت و معانی کے عالم ہوتے تھے۔ پرانی کتابوں کے نئے نسخے تیار کرنے میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات ان میں ترمیم کرتے اور اُن کو نئے سرے سے ترتیب دیتے تھے۔ اِن کے علاوہ لاتعداد مصنف موجود تھے

جن کی محیر العقول قوت تخلیق آئے دن نئی نئی تصنیفات عرصۂ وجود میں لاتی رہتی تھی۔ وصایا اور اوقاف کی برکت سے ہر مقام پر مساجد و مدارس میں کتب خانے (پبلک لائبریریاں) قائم ہو گئے۔ جن میں سے بعض تعداد کتب اور بعض مسودات کی صحت و درستی کے لئے مشہور تھے۔ کاترمیئر (QUATREMERE) نے چالیس کتب خانوں کا پتہ لگایا ہے۔ فان ہمر (VON HAMMER) نے اس تعداد میں معقول اضافہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی ممالک میں کتابوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن مدارس کی پبلک زندگی اور آزادانہ میل جول میں عزت کے ساتھ شریک ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یادداشت پر کامل بھروسہ ہو۔ بے شک زمخشری کا قول ہے کہ جس طرح سوداگر کی عزت اُس کی نقدی کے صندوق میں ہے۔ اسی طرح عالم کی عزت اُس کی بیاضوں میں ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے۔ کہ اُسکی شہرت کا انحصار زیادہ تر قوتِ حافظہ پر تھا۔

۱۷۔ قوّتِ حافظہ کی حیرت انگیز ترقی

ایسے علما کم نہیں تھے جنہوں نے بچپن میں قرآن لفظ بلفظ حفظ کر لیا پھر شعراء قدیم کی بیسیوں نظمیں سنا سکتے تھے۔ ساتھ ہی تمام علم فقہ جو بجائے خود ایک سمندر ہے ازبر تھا۔ اِس کے علاوہ ہزار ہا احادیث مع راویوں کے سلسلوں کے بتا سکتے تھے اور مجال نہیں کہ کہیں غلطی کر بیٹھیں۔ مروزی فخریہ کہتا تھا کہ میں ستر ہزار احادیث گویا ایک تھیلے میں لئے پھرتا ہوں۔ امام بخاریؒ کے

نکتہ چینوں نے آپ کی قوت حافظہ پر شبہ کا اظہار کیا اور آپ کا امتحان لیا گیا۔ آپ نے امتحان میں ایسے حیرت انگیز اور ہمہ گیر حافظہ کا ثبوت دیا کہ آپ کی شہرت ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئی۔ قوت حافظہ کی اس طرح غیر معمولی تربیت اسلامی نظام تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت تھی جو کہ ہر کو و مہ کے حلقۂ درس میں شریک ہو سکنے کی آزادی نے پیدا کر دی تھی۔

۱۸۔ آزادی درس

جہاں حلقۂ درس میں شرکت کی اجازت عام تھی۔ وہاں درس کی آزادی بھی کامل تھی۔ یعنی شریف مسلمان جو اپنے میں اس کی قابلیت دیکھتا تھا۔ بغیر کسی دشواری کے مسند درس پر بیٹھ سکتا تھا۔ مدارس کے قیام یعنی گیارھویں صدی (پانچویں صدی ہجری) تک صرف ان علوم میں جو شریعت مقدسہ کے ساتھ وابستہ تھے۔ درس دینے کے لئے کسی پرانے استاد کے ساتھ رشتۂ تلمذ کا ہونا ضروری تھا۔ چونکہ شریعت مذہب کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کہ خلافت کے اصول پر اساتذۂ فقہ کا سلسلہ آنحضرت صلعم تک جا پہنچے۔ نہ کوئی سرکاری امتحان تھا اور نہ استادوں کے تقرر کی کوئی خاص رسم تھی۔ جن علوم کا مذہب سے واسطہ نہ تھا۔ ان کے درس کے لئے پرانے علماء کا تلمذ ضروری نہ تھا۔ ابن سینا کو جس قدر کتابیں ہاتھ لگیں پڑھ ڈالیں۔ کچھ عرصہ طبابت

کی۔ جس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو درس دینے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ پندرہ برس کی عمر میں طب کے پروفیسر بن گئے۔ غلام بھی مدرس بن جاتے تھے۔

۱۹۔ اجازت (LICENSE OF TEACHING)

لیکن درس کی آزادی پر ایک پابندی عائد تھی۔ اور وہ یہ کہ کوئی مدرس پبلک میں درس دیتے وقت کسی دوسرے مصنف کی کتاب اس کی تحریری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ مصنف کی وفات کے بعد بھی اس کے ورثا سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ تیرھویں صدی (ساتویں صدی ہجری) میں صحیح بخاری کی تدوین کے تین سو برس بعد ایک عالم نے اسے درس میں استعمال کرنے کے لئے امام بخاری کے ورثا سے تحریری اجازت حاصل کی۔ مصنف کے بیٹوں کو باپ کی واضح اور بیّن وصیت سے ہی اس کی تصانیف کے استعمال کی اجازت دینے کا حق پہنچتا تھا کیونکہ بعض اوقات بیٹوں کو چھوڑ کر یہ حق ایک شاگرد کو ورثہ میں مل جاتا تھا۔ عورتیں بھی اس قسم کی اجازت دینے کی مجاز ہوتی تھیں۔ اجازت کی ضرورت ابتدا میں صرف تصنیفات کے متعلق تھی۔ لیکن بعد میں اُستادوں کے زبانی لیکچروں پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔ اور اُستاد کی صریح اجازت کے بغیر زبانی لیکچروں کا استعمال بھی ناجائز ٹھہر گیا۔ یہ اجازت گو اصل میں استاد کا اس کی علمی املاک پر صرف حق ملکیت ہی ظاہر کرتی تھی۔ لیکن وہ ساتھ ہی اس شاگرد کی قابلیت کی شہادت

بن گئی - جو مدرس بننا چاہتا تھا - اور جس کے لئے وہ اپنے اُستاد کے علمی متروکات کے استعمال کی اجازت طلب کرتا تھا - میرے خیال میں ہمارے ہاں کا (LICENTIAT) (سند یافتہ مدرس) اسی اسلامی دستور کی یادگار ہے - زمخشری کی طرح کئی استاد اجازت یعنی مدرسی کی سند دینے میں بہت پس وپیش کرتے تھے - ابن خلکان نے قاہرہ کے ایک عالم کا ذکر کیا ہے - جس نے اجازت کے لئے تحریری درخواستیں کیں - لیکن ناکام رہا - ان کے خلاف بعض استاد اس میں بڑی فراخدلی برتتے تھے - ان میں سے ایک کے متعلق لکھا ہے کہ طبق الارض بالسماعات والاجازات یعنی اس نے تحصیل وتدریس کی سندوں سے کرۂ ارض کو ڈھانپ دیا - سماعات کی سند سے مراد صرف یہ تھی کہ ایک شخص فلاں فلاں استاد کے حلقہ میں بیٹھا اور اس کے درس سے فیضیاب ہُوا ہے - لیکن جو کچھ اُس نے سُنا اُس پر دوسروں کو درس دینے کی اجازت اس میں شامل نہ تھی - بعض استاد جو کتاب پڑھاتے تھے - اس کے حاشیہ پر سرٹیفکیٹ لکھ دیتے تھے کہ فلاں شخص نے یہ کتاب ہم سے پڑھی - لیکن عام طور پر سرٹیفکیٹ علیحدہ کاغذ پر ہوتا تھا - اس پر استاد کے دستخط اور تاریخ ہوتی تھی - کہ فلاں تاریخ کو یہ سارٹیفکیٹ دیا گیا - ابن خلکان میں اس قسم کی سندوں کا ایک نمونہ موجود ہے +

جہاں ہر ایک استاد دوسروں کو مدرسی کی سند دینے کا حق رکھتا تھا - وہاں اس کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ اپنے ساتھ ایک نائب رکھے

جو پروفیسر ضعیف العمر ہو جاتے تھے۔ یا جنہیں تعلیم کے علاوہ سرکاری مصروفیتیں بھی رہتی تھیں۔ اکثر اپنے ساتھ نائب رکھتے تھے۔ مثلاً مسعود نیشاپوری نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں جوینی کی نیابت کی۔ جرمن سیاح اولیاریوس (OLEARIUS) نے ایران کی سیاحت کے دوران میں معمولی مدرسین کے ساتھ بھی نائب دیکھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ کہ ہر ایک مدرسے میں ایک پرنسپل مولا یعنی استاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خلیفہ ہے۔ جو مولا کا معاون اور نائب ہے +

جب مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ اور ان کی آمدنی کے ذرائع مستقل ہو گئے تو گو ان کے بانیوں اور بانیوں کے ورثاء کو استادوں کے عزل ونصب کا حق ہوتا تھا۔ لیکن استاد پھر بھی آزاد تھے کہ جس مضمون پر چاہیں لیکچر دیں۔ اور جو طریقۂ تعلیم چاہیں اختیار کریں +

حکومت صرف اس وقت دخل دیتی تھی جب مذہب کو خطرہ ہو۔ مذہب پر ناروا حملے کرنے پر ہر ایک عدالت میں استادوں پر دعویٰ کیا جا سکتا تھا۔ اہم مقدمات کے فیصلہ کا اختیار خلیفۂ وقت کے حق میں محفوظ ہوتا تھا۔ چنانچہ (حضرت) ذوالنون مصری کو خلیفۂ متوکل کے سامنے جوابدہی کے لئے بغداد کا سفر کرنا پڑا +

۲۰۔ طریقہ تعلیم

اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ نصاب اور طریقہ تعلیم میں کافی

بوقلمونی اور تنوع پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن آزادی سے خودسری مُراد نہ تھی۔
طریقہ ونظام تعلیم کی اہم خصوصیات مختصراً یُوں بیان کی جاسکتی ہیں:۔
لیکچروں کے درمیانی وقفہ کے متعلق کوئی خاص قاعدہ یا ٹائم ٹیبل نہ تھا۔ ہرایک استاد اپنی مرضی سے درس کا وقت مقرر کرتا تھا۔ بعض استاد ہر روز لیکچر کرتے تھے۔ بعض ہفتہ میں صرف ایک بار یعنی پیر کے دِن۔ عنبری اپنی مجالس الاملاء جمعہ کے دِن لگاتا تھا۔ بروی ہر روز کئی دفعہ لیکچر دیتا تھا۔ لیکچر جب مسجد میں ہوتے تھے۔ تو نماز کے بوقت بند کر دیئے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے موسمی تعطیلات کا دستور نہ تھا۔ غالباً تعطیلات لیکچروں کی طولانی پر منحصر ہوتی تھیں غرضیکہ تعطیلات کے متعلق پُوری آزادی تھی اور کوئی خاص قاعدے اس کے متعلق نہ تھے۔ لیکچر اکثر کسی ایک کتاب پر مبنی ہوتے تھے۔ اساتذہ بعض اوقات اپنی تصانیف ہی نصاب کے طور پر استعمال کر لیتے تھے اور اور بعض دوسروں کی۔ پختہ کار پروفیسروں کو کتابیں عموماً حفظ ہوتی تھیں اور لیکچر ہال میں داخل ہوکر اگر یاد آئے کہ کتابیں گھر بھول آئے ہیں۔ تو اس سے ان کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ لیکچر جب لکھایا جاتا تھا تو استاد آہستہ آہستہ بولتا تھا۔ لیکچر اکثر لکھا ہی دیئے جاتے تھے اس کا بہت التزام تھا کہ سامعین جلدی جلدی لکھیں۔ نیشاپور میں سلوکی کے لیکچر ہال میں پانچ سو دواتیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ اگر کوئی طالبعلم لکھنے میں کوتاہی کرتا تھا تو اس کو زجروتوبیخ بھی ہوتی تھی قشیری نہیں

لکھتا تھا۔ لیکن جو کچھ سنتا تھا۔ اسے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا استاد اسفراینی بھی اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ استاد صرف لیکچروں پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کی بھی احتیاط رکھتے تھے کہ سبق طلبا کی سمجھ میں آجائے اور ان کو ذہن نشین ہو جائے۔ اس غرض کے لئے باہم گفت وشنید ہوتی تھی۔ استاد طلبا سے سوال کرتا تھا۔ اور طلبا سے ایک دوسرے پر سوال کراتا تھا۔ جو طالب علم شدہ یعنی استاد کی مسند کے قریب بیٹھا ہوتا تھا۔ اسی سے گفتگو اور بحث کا آغاز ہوتا تھا بعض اوقات کسی ایک طالب علم کو (جو شاید کمزور ہو یا گھبراتا ہو) گفتگو کے لئے اپنے قریب بلا لیتا تھا۔ اکثر استاد کسی مضمون پر بحث کرنے کے وقت مسند سے اٹھ کر طلبا کے حلقے میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ ابتداء اسلام میں ہی امام زہری نے جو اولین اساتذہ میں سے تھے نمونہ قائم کرکے دکھا دیا کہ کس طرح بحث ومباحثہ اور گفت وشنید کے ذریعہ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ مجلس میں امام موصوف کبھی لوگوں کے پیچھے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ آگے کھڑے ہوتے تھے (کان یاتی المجالس من صدورھا ولا یاتیھا من خلفھا) حلقے میں آپ ہر ایک لڑکے۔ جوان اور بڈھے سے سوال کرتے اور کسی کو نہیں چھوڑتے تھے۔ آپ اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ مسجد میں ہی ایسا کریں۔ بلکہ لوگوں کے گھروں میں جا کر ان سے بات چیت کرتے۔ ان کو علمی مسائل سمجھاتے اور سبق کی مشکلات صاف کرتے تھے۔ نووی کی روائت ہے کہ امام موصوف انصاریوں کے

گھروں میں جاتے اور بوڑھی عورتوں سے بھی سوال پوچھتے۔ تعلیم اور اعادہ اسباق کے لئے طلبا کے گھروں میں جانا نظام تعلیم کا ایک جزو بن گیا جسے عادۃ التعلیم کہتے تھے۔ لیکن یہ صرف ان استادوں کا خاصہ رہا جن کو تعلیم کا خاص شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اعلےٰ مدارس کی تعلیم خالی سماعت سے گذر کر تفقہ کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔

کم از کم دسویں صدی (چوتھی صدی ہجری) سے یہ دستور ہو گیا کہ ہر ایک استاد کے ساتھ ایک معید رہے۔ جس کا فرض دوسرے طلبا کو سبق کے تکرار و اعادہ میں مدد دینا تھا۔ عموماً حلقہ میں سے ہی کسی ایک کو اس خدمت کے لئے چُن لیا جاتا تھا۔ تکرار سے سکول کا کام گھروں میں جاری رہتا تھا۔ اور معید کو امتیاز حاصل کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

تعلیم کا سلسلہ لیکچر ہال سے باہر بھی جاری رہتا تھا اور طلبا اُستاد کی صحبت میں رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ طلبا کے ہجوم کو کم کرنا گو استاد کی مرضی پر منحصر تھا۔ لیکن کوئی شوقین طالب علم ازالہ شکوک کے لئے علی الصبح استاد کا دروازہ جا کھٹکھٹائے تو استاد ناراض بھی نہ ہوتا تھا۔ اس قسم کے طلبا کا نام بعد میں قطرب (یعنی غول بے آرام) پڑ گیا اکثر ایسا ہوتا تھا کہ استاد مبتدیوں کو الگ پڑھاتا تھا۔ اگر استاد کا تعلق علم فقہ سے ہو جس کے سیکھنے والے سب سے زیادہ ہوتے تھے۔ تو اسے سرکاری ملازمت کے امیدواروں کے لئے بھی لیکچر دینے پڑتے تھے۔ اِن کے علاوہ بعض اوقات استاد عام دلچسپی کے مضامین پر بھی

لیکچر دیتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طلبا کے سوالات کس قدر مختلف النوع ہوتے ہوں گے۔ چھوٹی عمر کے طلبا کے لئے معمولی باتیں بھی بار بار بیان کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن حلقہ درس میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو تحصیل علم کی خاطر دُور و دراز کی سیاحتیں کر چکے تھے۔ وہ فائدے سننے یا فرضی سوالات کے حل طلب کرنے آتے تھے۔ اساتذہ کا کام اس سے بہت بڑھ جاتا تھا۔

جُوں جُوں ہم تاریخ اسلام کے آغاز کی طرف ہٹتے جائیں۔ اساتذہ کی مشکلات ہمیں اتنی ہی بڑھتی نظر آئیں گی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ علوم کی پوری تقسیم ابھی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہم ابو زناد کو دیکھتے ہیں۔ کہ جب مدینہ (منورہ) کی ایک مسجد سے نکلتا ہے۔ تو شاگردوں کا ایک گروہ اس کو چاروں طرف سے یُوں گھیرے ہوئے ہے جیسے کوئی سلطان وزراء و امراء دربار سے گھرا ہوُا ہو۔ ایک پوچھتا ہے۔ اسلام کے اس حکم کا کیا منشا ہے۔ دوسرا کہتا ہے ریاضی کا یہ سوال مجھے سمجھا دیجئے۔ تیسرا کہتا ہے۔ اس نظم کے معنی بیان فرما دیجئے چوتھا کسی حدیث کا مطلب پوچھتا ہے۔ پانچواں فقہ کا کوئی مسئلہ چھیڑ دیتا ہے۔ غرض ہر ایک شاگرد الگ الگ مضامین پر سوال کرتا ہے۔ ذہبی کی روایت ہے کہ ایک استاد طلبا کے ہجوم سے ایسا پریشان ہوُا کہ بھاگ کھڑا ہوُا۔ اور گھر پہنچ کر اندر سے کواڑ بند کر لئے! گو بعد میں علوم کی تقسیم سے یہ بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔ اور پروفیسر اپنے معزز پیشے کے وقار

کی بدولت طلبا کے ہجوم سے ایک حد تک محفوظ ہو گئے - پھر بھی اِشتغال فی الناس کا فرض جو پروفیسروں پر مذہبًا اور اخلاقًا عائد ہوتا تھا - اسلامی درس وتدریس کی آزادی کا ایک بڑا کٹھن پہلو تھا۔

۲۱ - پروفیسروں کی تنخواہیں

درس وتدریس کی اس آزادی کا تنخواہ پر بہت اثر پڑتا تھا - گیارہویں صدی (یا پانچویں صدی ہجری) تک اساتذہ کا اپنا فرض تھا کہ جس طرح ہو سکے اپنی معاش کی فکر خود کریں - جو شخص اپنے آپ کو علم کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا تھا - اس کے لئے ضروری تھا کہ یا تو خود صاحبِ ثروت ہو یا کسی صاحبِ جاہ کی سرپرستی پر انحصار کرے یا درس وتدریس کے ساتھ کوئی اور پیشہ بھی اختیار کرے یا اپنے واسطے مفتی یا قاضی کا منصب تلاش کرے - چونکہ فقہ کا علم اس زمانے میں سب سے زیادہ عملی حیثیت رکھتا تھا - اس لئے اس کے دلدادہ معاش کا اکثر مؤخر الذکر ذریعہ ہی اختیار کرتے تھے - امام شافعی ابھی پندرہ برس کے تھے کہ ایک طرف تحصیل علم میں مصروف تھے - اور ساتھ ساتھ فقاہت بھی کرتے تھے - (یدرس ویفتی)، مشہور امام الحرمین کی طرح کچھ استاد ایسے بھی تھے - جو ایک ہی وقت میں متعدد مناصب پر فائز ہوتے تھے - ایسے تو بہت تھے - جو پروفیسر بھی تھے اور خطیب بھی ان مناصب کی تنخواہیں

تھیں۔ مثلاً حلب کے قاضی کی تنخواہ ایک لاکھ درم تھی۔ لیکن ضمیر فروشی کئے بغیر اس قسم کے مناصب پر فائز رہنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہارون رشید کے قاضی امام ابو یوسف یا قیروان کے اس قاضی کی قسم کے لوگ جس کی افلاس پر لعنتیں ابن خلکان نے روایت کی ہیں ضمیر وغیرہ کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ لیکن متدین لوگ قاضی اور مفتی کے مناصب سے دور بھاگتے تھے۔ مثال کے طور پر امام ابو حنیفہ کو لے لو۔ آپ نے بغداد کے قاضی القضاۃ کے جلیل القدر اور نہایت منفعت بخش منصب پر لات مار دی اور جسمانی عذاب اور زندان کی موت کو ترجیح دی۔ ایک عالم کو قاضی مقرر کیا گیا۔ اس نے دوسرے دن ہی استعفےٰ داخل کر دیا۔

سب سے بری حالت فلالوجی یعنی لغت و معانی والوں کی تھی جن میں سے شاذ ہی کسی کو سرکاری ملازمت ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس کلیہ کی صرف ایک استثنےٰ مشہور ہے یعنی ابو تمام جامع حماسہ موصل کا گورنر مقرر ہو گیا۔ جو شخص اپنے آپ کو تحقیق زبان اور ادب لطیف کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا تھا۔ اور عام حیثیت کا مدرس یا پرائیویٹ معلم بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے معاش کے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پڑتے تھے۔ معاش کا سب سے بڑا ذریعہ شاعری اور بالخصوص قصیدہ گوئی تھی۔ مسلمانوں میں بہت کم ایسے بادشاہ اور امیر ہوئے ہوں گے۔ جن کی شان میں قصیدے نہ کہے گئے ہوں۔ دسویں صدی (چوتھی صدی ہجری) تک خلفاء کے دربار شاعروں سے بھرے رہتے تھے جب خلافت کو زوال ہوا اور جا بجا خود مختار

سلطان بن بیٹھے - تو قصیدہ گو شعرا ان کے درباروں میں جا پہنچے ۔

ممدوح جب خوش ہوتا تھا تو ایک ایک قطعہ پر جاگیریں بخش دیتا تھا۔ ایک بادشاہ نے ایک شاعر کا سارا قرض ادا کر دیا - لیکن شاعروں کو عموماً کم مایہ انعامات پر ہی قناعت کرنی پڑتی تھی - اس لئے مجبور تھے کہ شہر بشہر پھریں اور جو صاحبِ جاہ نظر آئے - اس کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھ دیں - شاید ہی کوئی ایسا پروفیسر ہو گا جو مدرسی کے ساتھ قاضی کے زر بخش منصب پر بھی مامور ہو اور کسی خانہ بدوش شاعر کی مدح سرائی سے محفوظ رہا ہو - اس میں کلام ہے کہ ان حالات میں ممدوح کی حالت زیادہ قابلِ رحم ہوتی تھی یا مدح سرا کی - جب کسی شاعر کو کوئی ایسا قدر شناس سلطان مل جاتا جسے اس کی صحبت سے دائمی حظ حاصل ہوتا تو اس شاعر کی قسمت کھل جاتی تھی - اس کے لئے ضروری تھا کہ آقا کی موجودگی میں جو غیر معمولی واقعہ پیش آئے - فوراً اُس پر یا تو کسی دوسرے کے موزون اشعار پڑھ دے یا خود ایک برمحل نظم کہہ دے - اگر اسے بازوں اور کتوں کی عادات سے کچھ واقفیت ہوتی - اور شکار میں تفنن طبع کا سرمایہ بہم پہنچانے کی قابلیت اس میں موجود ہوتی تو پھر کیا کہنے ہیں - اکثر کو اس لئے فروغ حاصل ہوتا تھا - کہ وہ تھوڑی بہت طبابت جانتے تھے - اور علم نجوم سے کسی قدر بہرہ ور ہونے کے علاوہ شربت تیار کرنا بھی اُن کو آتا تھا - یہ قابلِ رحم زندگی جس نے مسامرۃ الملوک کا نام نہاد علم پیدا کر دیا اور جس کے باعث قصہ گوؤں اور شاعروں کے گراں قدر کلام کا ایک انبار عرصۂ شہود میں آ گیا - اکثر لغت

ومعانی کے ان ماہرین کا حصّہ ہوتی تھی۔ جو درس دیتے دیتے تھک جاتے اور فکر معاش سے عاجز ہو جاتے تھے۔ اِس لئے اُن کا ذکر بھی اِس مضمون میں ضروری تھا۔ جسے ہم آج فلالوجی کا پروفیسر دیکھتے ہیں۔ کل وہی کسی امیر کا مصاحب اور قصیدہ گو ہے۔ خود متنبی کا بھی یہی حال تھا

لغت ومعانی کے ان ماہرین کی خوش نصیبی قابل صد رشک ہوتی تھی۔ جو شہزادوں کے اتالیق مقرر ہو جاتے تھے۔ مشرق میں خلفاء بنی عباس اور ہسپانیہ میں خلفاء بنی امیہ کے درباروں میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔

بلاشبہ علماء اور مدرسین کی معاش کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ بادشاہوں کے وزیروں کے ہاتھ میں ایک فنڈ ہوتا تھا۔ جس میں سے علماء کو وظائف ملتے تھے۔ لیکن ان کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔ بہت مشکل سے دستیاب ہوتے تھے۔ اور ان کے حصول کے لئے بہت ذلت اُٹھانی پڑتی تھی۔ مشہور محدث ترمذی کو صرف چار درہم ماہانہ ملتے تھے۔

گیارھویں صدی (پانچویں صدی ہجری) سے متعدد شہروں میں (مساجد سے الگ) مدارس قائم ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ کا معیار وہی پہلے دور کے وظائف ہی قرار پائے۔ یعنی تنخواہیں بہت کم تھیں غالباً یہی وجہ ہو گی کہ ایک پروفیسر جب کسی مدرسہ میں مقرر ہوتا تھا تو تھوڑے ہی دنوں میں پھر وہاں سے رخصت ہو جاتا تھا۔ جو زیادہ عرصہ رہتے تھے۔ وہ ایسے لوگ تھے جو پروفیسری کے علاوہ کسی دوسرے منصب پر بھی قابض ہوتے تھے۔ مدارس کے قیام سے جہاں طریقۂ تعلیم میں

کوئی قابل ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہاں استادوں کی تنخواہوں میں بھی کچھ فرق نہیں پڑا۔ تاریخ مدارس کی پہلی صدی میں تو کم از کم یہی کیفیت رہی +

مدارس کے قیام سے فلالوجی کے پروفیسروں کی معاش میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ کیونکہ نظامیہ بغداد جیسے بڑے مدارس میں ہی فلالوجی کی پروفیسری ہوتی تھی۔ چھوٹے مدارس میں اس کا انتظام نہ تھا۔ گیارھویں صدی (پانچویں صدی ہجری) میں فلالوجی کے ایک پروفیسر نے اپنی کیفیت ایک پرانے نحوی کے الفاظ میں یوں بیان کی ہے :-

"نحو اور نحویوں کی قدر اس لقمے سے بھی کم ہے جسے گھی یا اچھے سالن کی بجائے، تیل میں بھگویا گیا ہو"

اس سے ظاہر ہے کہ اسے اپنی پروفیسری پر چنداں ناز نہ تھا +

استادوں کی صرف ایک جماعت ہر جگہ فکر معاش سے آزاد تھی۔ یعنی وہ پروفیسر جو نوجوانوں کی ایک جماعت کو اپنے گرد جمع کر لیتے۔ اور ان کی تکمیل تعلیم کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے تھے۔ لین (LANE) نے فرانسیسی حملے سے پہلے کے مصری پروفیسروں کی حیثیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ قرون وسطےٰ (اسلام کی قرون اولےٰ) میں بھی قریباً یہی حالت تھی۔ ایک کسان اپنے لڑکے کو کسی پروفیسر کے سپرد کرتا ہے۔ تاکہ اسے سرکاری ملازمت کے قابل بنا دے۔ پروفیسر کی معاش کا ذمہ کسان اپنے سر لے لیتا ہے۔ شاگرد استاد کی خدمت کرتا ہے۔ استاد کے احترام کے لئے اس کی جلو میں

چلتا ہے۔ استاد حمام میں جائے تو شاگرد اس کا جوتا اٹھا لیتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لاتا ہے۔ اور بعض اوقات استاد کا کھانا بھی اپنے ہاتھ سے پکاتا ہے۔ اس قسم کے چند ایک طلبا استاد کو فکر معاش سے بالکل آزاد کر دیتے تھے۔ شاگردوں میں جو سب سے قابل ہوتا تھا۔ استاد کچھ عرصہ کے بعد اسے اپنی دامادی میں بھی لے لیتا تھا۔ استاد بھی اپنی طرف سے کمی نہ کرتے تھے۔ ایک استاد کا ذکر ہے کہ اس کا ایک شاگرد بیمار پڑ گیا۔ استاد نے خود اس کی تیمارداری کی۔ علاج کے اخراجات کے لئے اپنی سواری کا خچر تک فروخت کر دیا اور شاگرد کو کمر پر اٹھا کر گھر لایا +

۲۲۔ مفت تعلیم

ابتدائی عہد میں طلبا کے خورونوش کا انتظام بہت کم ہوتا تھا۔ اپنا خرچ عموماً وہ اپنے گھروں سے لاتے تھے۔ جو لوگ اپنے آپ کو تحصیل علم کے لئے وقف کرتے تھے۔ عموماً صاحب ثروت ہوتے تھے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا مدارس کے قیام کے ساتھ ہی طلبا کے لئے دارالاقامۃ بھی بنا دیئے گئے تھے۔ قزوینی کی ذیل کی عبارت سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بورڈنگ ہوس (دارالاقامۃ) مدارس کے ساتھ ہی کھل گئے تھے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ابن سہلان نے ابن سینا کے لئے کتابیں نقل کیں۔ کیونکہ ابن سینا بہت غریب تھے۔ اور تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور مدرسے ابھی قائم نہیں ہوئے تھے۔ تیرھویں صدی (ساتویں صدی

ہجری) سے بورڈنگ ہوس یقیناً کھل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب طلباء کے لئے جود وسخا کے دروازے نہائت بلند حوصلگی کے ساتھ کھولے گئے تو ان کے ساتھ ہی استادوں کی تنخواہوں میں بھی معقول اضافہ کیا گیا۔ مغل اور ترک سلاطین نے مسجدوں اور ان کے ساتھ وابستہ علمی درگاہوں کو گراں بہا اوقاف سے مالا مال کر دیا۔ اور نئی درگاہیں قائم کیں۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی انہوں نے قبروں سے خادمانِ علوم کی طرف دست تلطف بڑھایا۔ سلاطین اور وزراء کے مقبروں پر قرآن خوانی کے لئے اوقاف قائم کئے گئے۔ جن سے جواں سال اُستاد اور ترقی یافتہ طلباء دونوں مستفید ہوتے تھے۔ طلبا دارالاقامۃ میں اکٹھے مل کر رہتے تھے۔ دارالاقامۃ کی حیثیت وہی تھی۔ جو انگلستان کی یونیورسٹیوں میں کالجوں کی ہے۔ مدارس کیا تھے۔ شہد کی مکھیوں کے بڑے بڑے چھتے تھے۔ جن کا کام تھا کہ علم کے گلہائے رنگا رنگ سے دانش و حکمت کا شہد اکٹھا کریں۔

۲۳۔ دَورِ انحطاط

لیکن افسوس کہ کچھ مدت کے بعد یہ نقشہ بدل گیا۔ شہد کی مکھیاں نکھٹو بن گئیں۔ نظام تعلیم کا شیرازہ بکھر گیا۔ اگر میں کہدوں کہ پندرھویں صدی (نویں صدی ہجری) سے لے کر اسلامی مدارس کی علمی جد و جہد پر ایک خوابِ گراں طاری ہو گیا اور قرون اولے جیسی گہما گہمی قطعاً نہ رہی تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

چنانچہ انہوں نے ازراہِ تمسخر دارالاقامۃ کے ساکنوں کو سوختہ یا سوفتہ یعنی جلے ہوئے کا لقب دے دیا۔ حالانکہ ابتدا اسلام میں یہی لوگ طلبا۔ متلاشی اور علم کے مجاہد کہلاتے تھے۔

اسی لئے میں نے اپنا مضمون قرونِ وسطےٰ (اسلام کی قرون اولےٰ) تک محدود رکھا ہے۔ میں اس سے غافل نہ تھا۔ کہ ترکی سلطنت کی مساجد اور مدارس میں ازمنہ بعد میں بھی جوہر قابل پیدا ہوئے۔ اس تعلق میں حاجی خلفا اور اس کے علمی کارہائے نمایاں کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ حاجی خلفا ایک نوجوان فوجی افسر تھا۔ کسی مسجد میں ایک لیکچر سُن پاتا ہے۔ جس سے اس کے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے کہ جس قدر علم ممکن ہو حاصل کر لوں۔ چنانچہ علم کا شوق اسے شہر بشہر لئے پھرتا ہے۔ وہ ایک استاد چھوڑ دوسرے کی خدمت میں جاتا ہے۔ گو وہ ایک معزز افسر ہے لیکن قاضی زادہ اور دوسرے علماء کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے سے نہیں شرماتا۔ حتےٰ کہ وہ ترکی ادب کے آسمان کا نہایت درخشندہ ستارہ بن جاتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ دو سو برس پہلے کا ہے۔

بجھتے چراغ کا یہ آخری سنبھالا تھا۔ آہستہ آہستہ تحقیق و تفحص کی جگہ نقالی اور تصنع نے لے لی۔ تخلیق و مضمون آفرینی کی جگہ مدارس میں قدماء کے منتخبات رائج ہو گئے۔ تفاسیر پر تفاسیر لکھی جانے لگیں۔ اساتذہ کے مراتب و امتیازات کا اہتمام نہایت شدت کے ساتھ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ مراتب ہی مراتب رہ گئے اور مردوں کی قدر نہ رہی جس کا نتیجہ انحطاط۔ زوال

اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوسکتا تھا +

۲۴- استادوں کا ادب

مراتب اور اعزاز پہلے بھی ہوتے تھے۔ لوگ استاد کا ادب کرتے تھے۔ ادب سے ان کو سلام کرتے تھے۔ احترام کی خاطر ان کی جلو میں چلتے تھے۔ جب اُستاد اپنے خچر پر سوار ہونے لگتا تھا۔ تو لوگ رکاب تھام لیتے تھے۔ لوگوں کو اساتذہ کی ذات سے جو عقیدت تھی اور جس قدر وہ ان کی تعلیم اور ادب کرتے تھے۔ احترام کا اس سے زیادہ مؤثر طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا استاد کی وفات پر اس کا سب سے عزیز شاگرد استاد کی نعش کو غسل دیتا تھا اور شہر کا شہر ماتم میں شریک ہوتا تھا۔ جب مشہور آفاق امام الحرمین نے ۱۰۸۵ء (۴۷۸ ہجری) میں بمقام نیشاپور وفات پائی تو نہ صرف خراسان کے تمام شعراء نے امام موصوف کے ماتم میں مرثیئے لکھے۔ بلکہ سوداگروں نے دکانیں بند کر دیں۔ مسجد میں آپ کا منبر توڑ دیا گیا۔ آپ کے شاگردوں نے دواتیں پھوڑ دیں اور قلم توڑ دیئے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ انہوں نے استاد مرحوم کے ماتم میں ایک سال تک سکول بند رکھا۔ اکرام و احترام کے ایسے واقعات تاریخوں میں اکثر آتے ہیں +

۲۵- ثیاب اہل العلم (GOWN)

ابتدا اسلام میں ہی علما اور اساتذہ کے لئے امتیازی لباس قرار دے

دیا گیا تھا۔ چنانچہ ابن خلکان نے ثیاب اھل العلم کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ایجاد خلیفہ ہارون رشید کے دربار کے مشہور قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف کی جدت طرازی کا نتیجہ تھی۔ چونکہ مختلف جماعتوں نے مختلف امتیازی لباس اختیار کر لئے تھے۔ مثلاً صوفیا خرقہ پہنتے تھے۔ سپاہی فوج کی وردی سجاتے تھے۔ ضروری تھا کہ علماء کے لئے بھی ایک امتیازی لباس مخصوص ہو جاتا۔ اس امتیاز نے اس درجہ ترقی کی کہ مختلف علوم کے فضلا کے لئے جدا جدا لباس قرار پا گئے۔ علما کا دراز دامن اور کھلا جُبّہ جس کی آستینیں بہت فراخ ہوتی تھیں ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں گون (GOWN) پہننے کا رواج اسلامی مدارس سے ہی ماخوذ ہے۔

لیکن بعد میں یہ امتیازی لباس محض لباس ہی رہ گئے۔ اور وجہ امتیاز معدوم ہو گئی۔ ہوتے ہوتے وہ عوام کی نظر میں اتنے گرے کہ حقارت تمسخر اور ٹھٹھا کا نشانہ بن گئے۔ ترکی تیوہاروں کے موقعوں پر علماء کے شاندار اور بارعب جلوس اپنی تمام شوکت وجلال کے باوجود اسلامی نظامِ تعلیم کی بہار کو تازہ نہ کر سکے۔

وہ بہار نویں دسویں۔ گیارھویں اور ایک حد تک بارھویں صدی (تیسری سے چھٹی صدی ہجری) تک قائم رہی۔

علم کی مشعل اسلامی دنیا میں بجھ گئی۔ تاکہ دوسرے ممالک میں ضیاباری کرے۔ انسانی تمدن کی قسمت میں کیا یہی لکھا ہے کہ ہمیشہ اقوام کے ایک تنگ دائرے میں ہی محدود رہے تاریخ تمدن پر نظر ڈالیں تو اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم امید رکھتے بلکہ دست بدعا ہیں کہ علم و تمدن کے فیضان کو دوام اور عالمگیری نصیب ہو۔

ضمیمہ

دوہسن D'OHSSON نے ترکی کے موجودہ (انیسویں صدی کے پہلے نصف کے) مدارس کا نقشہ کھینچا ہے۔ جسکی چند نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱- ابتدائی تعلیم کے سکول جن کو مکتب کہتے ہیں غربا کے بچے ان میں مفت تعلیم پاتے ہیں۔ ان مکاتب میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے اور فرائض دین اور ترکی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس قسم کے ہر ایک سکول میں طلبا کی ایک تعداد ایسی ہوتی ہے۔ جن کو کھانا مسجد سے (مکتب مساجد کی نگرانی میں ہوتے تھے) ملتا ہے۔ اور مساجد کے ذمہ ہی ان کی رہائش کا خرچ اور انتظام ہوتا ہے۔ خوجہ (ترکی میں مکتب کے معلم کو خوجہ کہتے ہیں) ان کے والدین سے کبھی کچھ طلب نہیں کرتا۔ والدین اپنی ممنونیت کا اظہار اور طرح کر دیتے ہیں؎ +

؎ ہندوستان کے مسلمانوں میں تیوہاروں کے موقعہ پر استاد کو تحفے تحائف اور نذرانہ دینے کا رواج ہے۔ لیکن ان کے بدلے میں استاد کو ایک عیدی لکھ کر دینی پڑتی ہے (یاد رہے کہ یہ مضمون ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا تھا۔ جب کہ پرانے مکتب اور پرانی رسومات ابھی باقی تھیں۔ اور یورپ کی نقالی شروع نہیں ہوئی تھی) +

۲ - ہائی سکول اور کالج جن کو مدرسہ کہتے ہیں سلطنت عثمانیہ کے مدارس میں صرف فقہ اور الٰہیات کی تعلیم ہوتی ہے - لیکن تعلیم طریقہ اور انتظام کے ساتھ ہوتی ہے - ان علوم کو دس شعبہ جات میں تقسیم کیا جاتا ہے - ہر ایک شعبہ کو علم کے نام سے تعبیر کرتے ہیں - ان دس شعبہ جات کے نام یہ ہیں :- (۱) علم الصرف (۲) علم النحو (۳) علم منطق (۴) علم أدب (۵) علم معانی (۶) علم کلام یا علم الٰہیات (۷) علم حکمہ یعنی فلسفہ (۸) علم فقہ (۹) علم تفسیر (۱۰) علم حدیث - ہر ایک بڑی مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ہے - بعض میں دو دو بلکہ چار چار مدارس بھی ہیں - مسجد سلطان سلیمان میں پانچ مدارس ہیں - ان میں سے ایک مدرسہ علم طب کے لئے وقف ہے - مسجد سلطان محمد میں آٹھ مدرسے ہیں - مدارس کی عمارتیں عموماً پتھر کی ہیں - جن میں بارہ سے لے کر تیس کمرے ہوتے ہیں - کمروں کو حجرے کہتے ہیں - ایک کمرے میں ایک یا ایک سے زیادہ طلبا رہتے ہیں - یہ کالج کے کل طلبا کی تعداد پر منحصر ہے - ان طلبا کو سوفتہ کہتے ہیں - جو سوختہ سے بگڑ کر بنا ہے - اس کے معنی ہیں جلا ہوا اور مراد یہ ہے کہ طلبا نہائت مسکین - صابر اور بے زبان ہستیاں ہیں - اور نام مثلاً معید یا مرید بمعنی شاگرد اور دانشمند بمعنی طالبعلم بھی استعمال ہوتے ہیں - پروفیسروں (مدرسین) کے بجائے تعلیم کا کام معلم سرانجام دیتے ہیں - معلموں کو خوجے کہتے ہیں

ابتدا میں قانون کا منشاء تھا۔ کہ پروفیسر درس دیا کریں۔ لیکن پروفیسر اس قانون کی خلاف ورزی کرتے اور ادائیگی فرائض سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور مہینے میں صرف دو ایک بار مدرسے میں شکل دِکھا جاتے ہیں۔ پہلے دستور تھا کہ قسطنطنیہ کا مفتی اعظم مسجد سلطان بایزید کے مدرسے میں گاہ بگاہ جاتا اور اوپر کی جماعتوں کے طلبا کو لیکچر دیا کرتا تھا۔ وہ اسے ایک فرض سمجھتا تھا۔ کہ اپنے وسیع مطالعہ اور علمی تبحر سے ان مدارس کو فائدہ پہنچائے +

دوآہسن نے پرانے مدارس کے جو کوائف لکھے ہیں۔ اُن کے متعلق کچھ تصریح کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قدیم ترین مساجد کے بانیوں نے مساجد کے ساتھ مدارس بھی بنائے۔ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مدارس مسجدوں سے الگ گیارھویں صدی (پانچویں صدی ہجری) سے پہلے موجود نہیں تھے۔ لہذا دوآہسن کا دعوے باعتبار اپنی عمومیت کے قابل تسلیم نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ابتدا اسلام میں ہی بعض مساجد کے ساتھ تعلیمی درسگاہوں کی عمارتیں بھی بن گئی ہوں۔ جس طرح مدارس کے قیام کے بعد بھی مسجدیں درسگاہوں کا کام دیتی رہیں۔ جن کا ذکر تاریخوں میں اکثر آتا ہے +

جائے قیام کے لحاظ سے مدارس کی تمام قسموں کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) استاد اپنے مکان پر درس دیتا تھا۔ ۴۶۲ھ ہجری (مطابق ۱۰۷۰ء) میں اصفہان میں ایسے مدارس کا ذکر آتا ہے (۲) بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مکتب

تھے (۳) اعلےٰ طلبا کے لئے درسگاہیں تھیں جن کو رباط کہتے تھے۔ رباط میں پروفیسروں اور طلبا کی سکونت کے لئے صرف کمرے ہوتے تھے۔ کھانے کا انتظام نہ تھا۔ سنہ ۱۴۲۰ء میں مکہ معظمہ میں گیارہ کالجوں کے علاوہ متعدد ایسے رباط تھے جن میں بے مایہ حاجی بھی آ کر ٹھہر جاتے تھے۔ (۴) صوفیا اپنے لیکچر خانقاہوں میں دیتے تھے گو کبھی کبھی کالجوں کے ہال کمروں میں بھی درس دے آتے تھے (۵) کالج یعنی مدرسے جو مسجدوں سے ملحق ہوتے تھے (۶) لیکن کیا بلحاظ عمومیت اور کیا بلحاظ مدت ابتدائی اور اعلےٰ تعلیم کی خدمت سب سے زیادہ مساجد کی ہے۔ اسماء رجال کی کتابوں میں باربار ذکر آتا ہے کہ فلاں استاد فلاں مسجد کے فلاں کونے میں درس دیا کرتا تھا۔ بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیک وقت دو یا دو سے زیادہ استاد ایک ہی مسجد میں درس دیتے تھے۔ ایک ایک زاویہ میں اور دوسرا دوسرے زاویہ میں۔ زاویہ کا لفظ ذرا تشریح طلب ہے۔ ابن خلکان نے امام شافعیؒ کے آخری ایام زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ میرے خیال میں اس واقعہ سے زاویہ کے مفہوم کی تصریح ہو جاتی ہے۔ امام شافعیؒ جب بستر مرگ پر تھے تو آپ کا سب سے عزیز شاگرد مسجد میں آیا تاکہ استاد کی جگہ درس دے۔ لیکن وہاں ایک دوسرا شاگرد اس عزت کا دعوےدار بن بیٹھا۔ بہت ہاتھا پائی کے بعد فیصلہ ہوا کہ دونو ایک ہی مسجد میں درس دیں پہلا شاگرد اسی طاق یا محراب میں جہاں امام شافعیؒ بیٹھ کر درس دیتے تھے اور دوسرا ایک طاق چھوڑ تیسرے طاق میں جا بیٹھا۔ پس زاویہ سے مراد ایک طاق ہے۔ بشرطیکہ مسجد کی طرز عمارت مراکشی بزنطینی ہو۔ الجامع سے مراد اصل مسجد اور ملحقہ مدرسہ ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات علماء کی کانفرنسیں دارالکتاب (لائبریری) میں ہی منعقد کی جاتی تھیں۔ چنانچہ فلسفیوں کی وہ بحث جس کا ذکر مقامات حریری کے دوسرے مضمون میں ہے۔ بصرے کے کتب خانہ کے ہال میں ہوئی تھی۔ دیوان النظر (CHANCERY OFFICE) میں جہاں بے معنی گپ شپ اُڑتی تھی وہاں علما کے درمیان علمی گفتگو نیں بھی ضرور ہوتی ہونگی۔ تاہم دارالکتاب اور دیوان النظر مدارس میں شمار نہیں ہوسکتے۔ خلیفہ حکم نے مصر میں دارالحکمہ بنوایا تھا وہ بہت تھوڑا عرصہ قائم رہا +

جہاں علم وفضل کا شوق اس قدر عالمگیر ہو۔ جیسا اس زمانے کے مسلمانوں میں تھا۔ وہاں یہ بیان کی ضرورت نہیں رہتی۔ کہ علم دوست سلاطین اور وزراء کی سرپرستی میں علمی کلب اور سوسائٹیاں بھی ضرور ہوتی ہوں گی۔ علامہ ابن خلکان نے ان کا بھی ذکر کیا ہے +

بکتابت محمد عبدالحکیم صدیقی ساکن جنڈیالہ۔ ڈاکخانہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

(مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپا)